

فلسفہ تسمیہ



پروفیسر یاکٹر محمد سہرا نقادی

فلسفہ تسمیہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری



منہاج القرآن پبلیکیشنز

365- ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5168514، 3-5169111

یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، فون: 7237695

www.Minhaj.org - www.Minhaj.biz

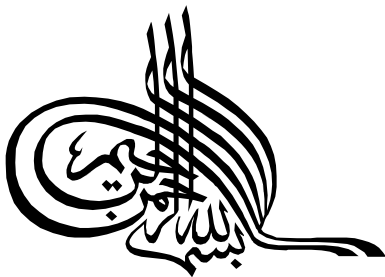
جملہ حقوق بحق تحریک منہاج القرآن محفوظ ہیں

نام کتاب	:	فلسفہ تسمیہ
مصنف	:	پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری
پروف ریڈنگ	:	عبدالجبار قمر، محمد علی قادری
اشاریہ و تخریج	:	عبدالجبار قمر
کمپوزنگ	:	محمد یامین (منہاجین)
مطبع	:	منہاج القرآن پرنٹرز، لاہور
نگرانِ طباعت	:	محمد جاوید کھٹانہ (منہاجین)
اشاعت اول	:	جون 1981ء (2,000)
اشاعت دوم	:	فروری 1983ء (2,000)
اشاعت سوم	:	نومبر 1984ء (5,000)
اشاعت چہارم	:	جون 1985ء (1,100)
قیمت	:	20/- روپے

نوٹ: ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور خطبات و لیکچرز کے آڈیو / ویڈیو کیسٹس اور CDs سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لئے تحریک منہاج القرآن کے لئے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاج القرآن پبلیکیشنز)

sales@minhaj.biz




مَوْلَايَ صَلَّى وَ سَلَّمَ دَائِمًا اَبَدًا
عَلَى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ
مُحَمَّدُ سَيِّدُ الْكُوْنِيْنَ وَ الثَّقَلِيْنَ
وَ الْفَرِيْقِيْنَ مِنْ عُرْبٍ وَ مِنْ عَجَمٍ

﴿ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَ عَلَى آلِهِ وَ أَصْحَابِهِ وَ بَارَكَ وَ سَلَّمَ ﴾

حکومت پنجاب کے نوٹیفکیشن نمبر ایس او (پی۔۱) ۱-۳ / ۱-۸۰ پی آئی وی،
 مؤرخہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء؛ حکومت بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۷-۴-۲۰-۲۰ جنرل و ایم / ۴
 ۷۳-۹۷، مؤرخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء؛ حکومت شمال مغربی سرحدی صوبہ کی چٹھی نمبر
 ۲۴۴۱۱-۶۷-۱ / اے ڈی (لابریری)، مؤرخہ ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء؛ اور حکومت
 آزاد ریاست جموں و کشمیر کی چٹھی نمبر س ت / انتظامیہ ۶۳-۸۰۶۱-۹۲، مؤرخہ ۲
 جون ۱۹۹۲ء کے تحت ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف کردہ کتب تمام سکولز اور کالجز کی
 لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
	<u>تسمیہ اور اس کے احکام شرعی:</u>	❁
۷	تسمیہ کی ترکیبِ نحوی	۱
۸	تسمیہ کی شرعی حیثیت	۲
۹	نماز میں قرأتِ تسمیہ کا حکم	۳
۱۲	تسمیہ سے ہر کام کے آغاز کا حکم	۴
۱۶	<u>حذفِ فعل کی حکمت:</u>	❁
۱۶	پہلی حکمت	۵
۱۷	دوسری حکمت	۶
۱۹	تیسری حکمت	۷
۲۱	آیت الحمد سے استدلال	۸
۲۲	چوتھی حکمت	۹
۲۴	<u>حرفِ با کی افادیت:</u>	❁
۲۴	بائے مصابحت	۱۰
۲۷	بائے استعانت	۱۱
۳۰	بائے تبرک	۱۲
۳۰	<u>کلمہ اسم سے ذاتِ نبوی پر استدلال:</u>	❁
۳۲	تسمیہ میں فعل، حرف اور اسم کے باہمی تعلق پر اشارہ لطیف	۱۳
۳۳	تصور دلالت اور کلمہ اسم کی وساطت	۱۴
۳۴	ذاتِ محمدی ﷺ کلمہ اسم کا مدلوں کا مل ہے	۱۵

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۳۷	ذات محمدی ﷺ اور شان اسمیت	
۴۰	حرف جار کی نسبت ایک لطیف نکتہ	۱۶
۴۳	اشاریہ	۱۷
۴۸	کتابیات	۱۸

تسمیہ کی ترکیب نحوی اور ایک لطیف نکتہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں ”حرف باء“ جار ہے ”اسم“ مجرور اور مضاف ’لفظ اللہ‘ مضاف الیہ اور موصوف ہے لفظ ”الرحمن الرحیم“ دونوں یکے بعد دیگرے موصوف یعنی اللہ کی صفات ہیں۔ موصوف (اللہ) اپنی دونوں صفات (الرحمن الرحیم) کے ساتھ مل کر اسم کا مضاف الیہ بن گیا اور مضاف (اسم) اپنے مضاف الیہ (اللہ الرحمن الرحیم) سے مل کر جار یعنی ”حرف باء“ کا مجرور ہو گیا۔ اب اس حرف باء (جار) کا ایک متعلق ہے جو فعل محذوف ہے۔ وہ یہاں أشرع‘ أبدأ یا أقراء وغیرہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جار و ”مجرور“ اور ”فعل محذوف“ جس میں فاعل بھی ہے۔ سب ل کر ”جملہ فعلیہ خبریہ“ پر مبنی ہو گئے۔ اس کی دوسری صورت یہ بھی ہے کہ یہاں فعل محذوف صیغہ امر أبدأ یا أقراء کو مانا جائے۔ اس طرح تسمیہ ”جملہ فعلیہ انشائیہ“ قرار پائے گا۔

یہاں ایک لطیف نکتہ قابل غور ہے کہ تسمیہ کا ”جملہ فعلیہ خبریہ یا جملہ فعلیہ انشائیہ“ ہونا فعل محذوف کی نوعیت پر مبنی تھا۔ اگر فعل محذوف کی بجائے زیادہ توجہ حرف باء کے مفہوم اور اس کی نوعیت کے تعین پر کی جائے جیسے کہ بعد میں بیان کیا جائے گا تو تسمیہ کا کلام ہر صورت میں ”دعائیہ“ قرار پا جاتا ہے کیونکہ یہاں حرف باء تین حالتوں میں سے یقیناً کسی نہ کسی ایک حالت کا حامل ہے اور وہ ہیں۔ ”الصاق ومصاحبت“ ”استمداد واستعانت“ اور ”تبرک وتیمن“ لہذا ”باء“ مذکورہ بالا میں سے جس حالت پر بھی دلالت کرے۔ کلام تسمیہ ایک ”دعا“ بن جاتی ہے اور یہی مقصود الہی ہے۔

تسمیہ کی شرعی حیثیت:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے الفاظ کو اصطلاح میں ”تسمیہ“ کہا جاتا ہے۔ یہی تسمیہ ایک آیت کے حصے کے طور پر قرآن حکیم کی سورۃ النمل میں وارد ہوا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بالاتفاق حصہ قرآن بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمٍ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللّٰهِ

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ سے (آیا) ہے اور وہ اللہ کے نام سے

شروع (کیا گیا) ہے جو بے حد مہربان (النمل؛ ۲۷: ۳۰)

بڑا رحم فرمانے والا ہے ○

آئمہ فقہ میں سے شوافع اسے سورۃ الفاتحہ کا جزو قرار دیتے ہیں۔ جب کہ بعض علماء ہر سورت سے پہلے بسم اللہ وارد ہونے کی بناء پر سوائے سورۃ برات کے اسے ہر سورت کا جزو تسلیم کرتے ہیں۔ ان میں ابن عباسؓ ابن عمرؓ ابن زبیرؓ ابو ہریرہؓ اور تابعین میں سے عطاءؓ طاؤسؓ سعید بن جبیرؓ کحولؓ اور زہریؓ وغیرہم کے اسماء بیان کیے جاتے ہیں۔ امام عبد اللہ بن مبارکؒ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک قول اسطرح منقول ہے۔ قول معروف اور مذہب مختار یہ ہے کہ بسم اللہ قرآن کا حصہ ہے۔ لیکن سورۃ الفاتحہ یا دوسری سورتوں کا جزو نہیں بلکہ ہر سورت سے پہلے اسے محض امتیاز و انفصال اور تہمین و تبرک کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ عبد اللہ بن عباسؓ سے اسناد صحیح کے ساتھ مروی ہے:

مسلمانوں دو سورتوں کے درمیان فرق و انفصال کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ چنانچہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے نازل ہونے سے ایسی حد فاصل قائم ہوئی کہ لوگوں کو اس کے ذریعے ہر ایک سورت کے شروع ہونے یا ختم ہونے اور دوسری کے شروع ہونے کی معرفت حاصل ہو گئی۔

كان المسلمون لا يعرفون انقضاء السورة (وفى رواية لا يعرفون فصل السورة) حتى تنزل بسم الله الرحمن الرحيم فاذا نزلت عرفوا ان السورة قد انقضت، وفى رواية ان السورة قد ختمت واستقبلت او ابتداءت سورة اخرى -

۱- سنن ابی داؤد: ۱۲۲؛ کتاب الصلاة؛ باب من جهر بھاء رقم: ۷۸۸
 ۲- السنن الکبریٰ بیہقی: ۲: ۲۳۳
 ۳- المستدرک للحاکم: ۱: ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳
 رقم: ۸۴۶، ۸۴۵

مدینہٴ بصرہ اور شام کے قراء و فقہاء بھی اسی قول کے موید ہیں کہ ”بسم اللہ“ ”سورۃ ائمل“ میں وارد ہونے کے اعتبار سے ایک مرتبہ تو قرآن کی مستقل آیت ہے۔ لیکن باقی تمام سورتوں سے اس کا ورود محض علامت فصل کے طور پر ہے تاکہ اس کے ذریعے دو متصل سورتوں کے درمیان واضح فرق کا پتہ چل جائے۔ امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ امام سفیان ثوریؒ امام احمد بن حنبلؒ امام اوزاعیؒ وغیرہم کا مذہب بھی یہی ہے۔

نماز میں قرأت تسمیہ کا حکم:

تسمیہ کی شرعی حیثیت کے تحت تسمیہ کا سورہ فاتحہ کا حصہ نہ ہونا اس امر سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ جہری نمازوں میں قرأت بالجہر کا آغاز ”الحمد للہ رب العالمین“ سے

کرتے تھے۔ بسم اللہ کی قرأت جبراً نہ فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں چند احادیث ملاحظہ ہوں۔
حضرت انسؓ سے مروی ہے:

سنن داری میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ جبری قرأت کا آغاز الحمد للہ سے فرمایا کرتے تھے صحیح مسلم کے مزید الفاظ یہ ہیں کہ پہلی اور دوسری مرتبہ دونوں قرأتوں میں (جبراً) بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم
وابابکر و عمر و عثمان کانوا
یفتتحون القراءة بالحمد للہ رب
العلمین وزاد مسلم لا یدکرون
بسم اللہ الرحمن الرحیم فی اول

قراءة ولا فی آخرها
۱۔ صحیح مسلم ۱: ۲۴۰ کتاب الصلاة رقم: ۵۲

۲۔ مسند احمد بن حنبل ۳: ۱۰۱: ۱۱۴

۳۔ سنن الداری ۱: ۳۰۰ مطبوعہ دار القلم
دمشق

۴۔ سنن النسائی ۲: ۹۷، رقم: ۹۰۲

سعید بن منصور سنن میں ابووائلؓ سے اسناد صحیح کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔
کانوا یسرون التعوذ والبسملة
فی الصلوٰۃ۔
صحابہ کرام نماز میں تعوذ اور تسمیہ آہستہ
پڑھتے تھے۔
حضرت انسؓ اسناد صحیح کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ
ﷺ، ابو بکرؓ اور عثمانؓ کے پیچھے نماز
پڑھی ہے۔ میں نے ان میں سے کسی کو
بھی جبراً بسم اللہ پڑھتے نہیں سنا۔

قال صلیت خلف رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر
وعمر و عثمان (رضی اللہ عنہم) فلم
أسمع أحدا منهم یجہرء بسم اللہ
الرحمن الرحیم۔

(سنن نسائی ۲: ۹۹، رقم: ۹۰۷)

آنحضرت ﷺ کی دور میں ابتداء دور ان نماز بسم اللہ جبراً پڑھتے تھے۔ اس پر مشرکین
مکہ استہزاء کرتے کیونکہ وہ ”مسلمیہ کذاب“ کو رحمن کہتے تھے اور بسم اللہ الرحمن الرحیم سن کر وہ
طعنہ دیتے کہ محمد ﷺ اہل یمامہ کے معبود ”مسلمیہ کذاب“ کی طرف بلاتے ہیں۔ اس پر حضور
اکرم ﷺ نے صحابہ کو بسم اللہ کی قرأت آہستہ کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

لہذا حضور ﷺ نے حکم صادر فرمایا کہ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پوشیدہ پڑھا کرو
پھر تا وقت وفات کبھی نماز میں بِسْمِ اللّٰهِ
پکار کر نہیں پڑھی۔

فامر رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم باخفائها فما جهر بها حتی
مات۔

(طبرانی)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔

جب آیت بسم اللہ نازل ہوئی تو حضور
اکرم ﷺ نے فرمایا کہ بسم اللہ بلند آواز
سے نہ پڑھی جائے۔

فلما نزلت هذه الآية أمر رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان
لا یجهر بها۔

(طبرانی)

اسی طرح صحیح بخاری، صحیح مسلم اور طبرانی کے علاوہ مصنف ابن ابی شیبہ، ترمذی، ابوداؤد،
نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، اور بیہقی وغیرہ متعدد کتب حدیث میں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ
تسمیہ کی قرأت سورہ فاتحہ یا کسی اور سورت کے حصے کے طور پر نہیں بلکہ الگ حیثیت سے کی جاتی
تھی۔ اگر یہ حصہ سورہ فاتحہ ہوتی تو یقیناً اس کی قرأت بھی اس کے ساتھ بلند آواز سے کی جاتی۔ جن
روایات میں بسم اللہ کی قرأت کا دوران نماز بلند آواز سے ہونا مذکور ہے وہ مکی دور کے اوائل ایام
سے متعلق ہیں۔ لیکن بعد میں صراحت کے ساتھ حضور اکرم ﷺ نے پکار کر پڑھنے کی ممانعت
فرمادی۔ لہذا تسمیہ کا نماز میں پڑھا جانا تلاوت قرآن کے آغاز و افتتاح کے طور پر ہے۔ کیونکہ حمد
و ثناء کے بعد جب سورہ فاتحہ کی قرأت شروع ہوتی ہے تو یہی دوران نماز تلاوت قرآن کا آغاز ہے
اور یہاں بھی یہ حکم ہے کہ تلاوت قرآن کا آغاز پہلے تعوذ (اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم)
اور پھر تسمیہ (بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ) سے کیا جائے۔

تسمیہ سے ہر کام کے آغاز کا حکم (تاریخی پس منظر):

شریعت اسلامیہ میں ہمیشہ سے یہی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ ہر جائز اور مشروع کام کا
آغاز خدا کے نام سے کیا جائے۔

۱۔ جب نوع علیہ السلام نے طوفان سے بچاؤ کے لیے اذین الہی کے مطابق کشتی تیار کر لی اور اپنے
ساتھیوں کو اس میں سوار کر لیا تو کشتی چلانے سے قبل فرمایا:

اور نوح نے کہا تم لوگ اس میں سوار ہو
جاؤ اللہ ہی کے نام سے اسکا چلنا اور اسکا
ٹھہرنا ہے بے شک میرا رب بڑا ہی
بخشنے والا نہایت مہربان ہے O

وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرَاهَا
وَمُرْسَلَهَا اِنَّ رَبِّي لَعَفُوٌّ رَّحِیْمٌ O
(ہود: ۱۲، ۱۳)

۲۔ اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ صبا کو جو تبلیغی خط لکھا۔ اس کا آغاز بھی انہی مبارک

کلمات سے کیا گیا تھا۔

بے شک وہ (خط) سلیمان کی جانب سے (آیا) ہے اور وہ (اللہ کے نام سے شروع کیا گیا) ہے جو بے حد مہربان بڑا رحم فرمانے والا ہے ۵

إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
(النمل: ۲۷: ۳۰)

۳۔ عہد عیسوی میں بھی ان کلمات کی برکات و تاثیرات کا پتہ چلتا ہے۔ اسرائیلیات میں ایک روایت مذکور ہے کہ عیسیٰ ﷺ کا ایک قبر پر گزر ہوا۔ آپ نے فرشتوں کو دیکھا کہ وہ صاحب قبر پر عذاب کر رہے ہیں۔ جب دوسری مرتبہ گزر ہوا تو دیکھا کہ رحمت کے فرشتے نور کے طبق اس پر پیش کر رہے ہیں۔ آپ کو بہت تعجب ہوا، نماز پڑھی اور کشف حال کے لیے دعا کی۔

پس اللہ تعالیٰ نے وحی کی انکی طرف کہ اے عیسیٰؑ یہ بندہ گناہ گار تھا اور اپنی موت کے دن سے میرے عذاب میں گرفتار تھا۔ وقت مرگ اس کی بیوی حاملہ تھی۔ جس نے بعد میں ایک بچہ پیدا کیا۔ اس کی ماں نے اسے پالا اور معلم دین کے سپرد کر دیا۔ اس معلم نے جب اس بچے کو بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھائی تو ہم کو شرم آگئی کہ اس کا باپ قبر میں عذاب میں مبتلا رہے اور اس کا بیٹا زمین پر ہمارے نام کا ذکر کرے پس ہم نے اس کو بخش دیا۔

فاوحي الله تعالى إليه: يا عيسى،
كان هذا العبد عاصياً ومذمات
كان محبوساً في عذابي، وكان
قد ترك إمراة حبلى فولدت
ولدا وربته حتى كبر، فسلمته
الى الكتاب فلقنته المعلم بسم
الله الرحمن الرحيم فاستحييت
من عبدى إن أعذبه بنارى فى
بطن الأرض وولده يذكر اسمى
على وجه الارض -
(التفسير الكبير: ۱: ۱۷۲)

۴۔ اسی طرح حضور ﷺ نے بھی ہر کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ یہ حکم بعض معاملات میں ”واجب“ کا درجہ رکھتا ہے۔ بعض میں ”سنت“ کا اور بعض میں ”مستحب“ کا۔ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:

سو تم اس (ذبیح) سے کھایا کرو جس پر
(ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ -
(الانعام: ۶: ۱۱۸)

اس سے آگے مزید حکم دیا گیا۔

اور تمہیں کیا ہے کہ تم (ذبیحہ) سے نہیں کھاتے جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہے۔

وَمَا لَكُمْ إِلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِّرْتُمْ
اللَّهُ عَلَيْهِ۔

(الانعام: ۱۱۹)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

جو کام بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع نہ کیا جائے وہ ناقص رہتا ہے یعنی اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔

كل أمر ذي بال لا يبدأ فيه بسم
الله الرحمن الرحيم فهو أجزم۔

۱۔ سنن ابن ماجہ: ۶۱۰، رقم: ۱۸۹۴

۲۔ مجمع الکبیر: ۶۸: ۱۹، رقم: ۱۴۱

۳۔ کنز العمال: ۵۵۵، رقم: ۲۴۹۱

اس حدیث کا مفہوم اس طرح سمجھیں جیسے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

اس شخص کا وضو نہیں جس نے اس پر بسم اللہ نہ پڑھی۔

لا وضوء لمن لم يذكر اسم الله
عليه۔

مسند احمد بن حنبل: ۲: ۴۱۸

مسند احمد بن حنبل: ۳: ۴۱

مسند احمد بن حنبل: ۴: ۷۰

مسند احمد بن حنبل: ۵: ۳۸۱

مسند احمد بن حنبل: ۶: ۳۹۷

اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ بسم اللہ کے نہ پڑھنے سے وضو کی فرضیت ہی ناقص رہ جاتی ہے بلکہ فرض تو ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن سنن و مستحبات کی شمولیت سے جو کمال نصیب ہوتا ہے اس سے محروم رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ہر فعل جو بغیر بسم اللہ کے شروع کیا جائے۔ ممکن ہے کہ دینی لحاظ سے مطلوبہ نتائج کے حصول میں تو ناکام نہ ہو لیکن اپنے اجر و ثواب کے اعتبار سے عند اللہ کامل نہ ہوگا۔ اسی روحانی کمال اور نقص کی طرف متذکرہ بالا حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

آپ غور فرمائیں کہ کلام الہی جو سرا سر خیر و برکت ہے۔ جب اس کے پڑھنے سے بھی پہلے بسم اللہ کا پڑھنا بطور شرط لازم ہے تو دیگر امور حیات سے قبل تسمیہ کا پڑھا جانا کس قدر ضروری ہوگا۔ آنحضرت ﷺ کی اپنی عملی مداومت بھی اسی اصول پر تھی۔

۵۔ حتی کہ باری تعالیٰ نے خود اپنے کلام مبارک کے نزول کے آغاز و افتتاح کے لیے جو کلمات منتخب فرمائے وہ بھی ”تسمیہ“ کی نوعیت کے تھے۔ غار حرا میں گونجنے والی سب سے پہلی قرآنی صدا بھی یہ تھی۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ
(العلق، ۹۶:۱)

اے محمد آپ پڑھیے اپنے رب کے نام
کے ساتھ جس نے آپ کو اور سب کو پیدا
کیا

گویا آدابِ قرأت میں سب سے پہلا قرینہ بسم اللہ سے شروع کرنا تھا اور اسی قرینہ کے مطابق نبی اکرم ﷺ سے قرأت کا آغاز کرایا گیا۔ مفسرین عام طور پر بسم اللہ کو معنوی وسعت کے اعتبار سے تمام قرآنی علوم کی جامع قرار دیتے ہیں۔ امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں۔

تمام علوم و معارف چار الہامی کتابوں
میں درج کیے گئے ہیں اور ان کے تمام
علوم قرآن میں اور قرآن کے تمام علوم
سورۃ الفاتحہ میں اور سورۃ الفاتحہ کے
تمام علوم بسم اللہ الرحمن الرحیم میں اور
اس کے تمام علوم بسم اللہ میں۔

كل العلوم مندرج في الكتب
الاربعة وعلومها في القرآن
وعلوم القرآن في الفاتحة وعلوم
الفاتحة في (بسم الله الرحمن
الرحيم) وعلومها في الباء من
بسم الله

(تفسیر کبیر: ۹۹:۱)

چنانچہ تسمیہ کی ہمہ پہلو تفسیر اسی طرح ناممکن ہے جیسے پورے قرآن کی۔ تاہم یہاں اس کے چند گوشوں پر کچھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

حذفِ فعل کی حکمت:

قرآن میں تسمیہ کا بیان اس طرح ہے بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اللہ کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو نہایت مہربان رحمت والا ہے۔ یہاں ایک خاص امر قابلِ توجہ ہے کہ قرآنی عبارت میں ”شروع کرتا ہوں“ کے لیے کوئی لفظ یا کلمہ استعمال نہیں ہوا۔ ترجمے میں یہ الفاظ معنوی طور پر از خود تصور کیے جاتے ہیں۔ درحقیقت قرآن کے اس انداز میں خاص حکمت نہاں ہے۔

اگر قرآن ”شروع کرتا ہوں“ کے الفاظ اپنی عبارت میں استعمال کرتا تو اس کی صورت یہ ہوتی ابداء... اَشْرَعُ یا اَبْدَاءُ (میں آغاز کرتا ہوں)۔ ان میں ہر لفظ فعل اور فاعل دونوں کا جامع ہوتا۔ عام طور پر یہی عربی ادب کا اسلوب ہے کہ فعل اور فاعل اکٹھے ہوا کرتے ہیں۔ اب اس کی دو ہی صورتیں ممکن تھیں۔

- ۱۔ ایک یہ کہ اَبْدَاءُ وغیرہ کا لفظ بسم اللہ سے پہلے استعمال کیا جاتا۔
- ۲۔ دوسری یہ کہ ایسا لفظ بسم اللہ کے بعد استعمال ہوتا۔ لیکن قرآن نے اسے ہر صورت میں ہی مخدوف اور مضمحل کر دیا۔ اس کی چند حکمتیں ہیں۔ ان حکمتوں کے بیان سے قبل یہ اصول ذہن نشین ہو جانا چاہیے کہ بعض اوقات عربی عبارت میں ایسے حروف استعمال ہوتے ہیں جن سے پہلے کوئی فعل مخدوف تصور کیا جاتا ہے یعنی اس کا شمار معنی میں تو ہوتا ہے لیکن عبارت میں نہیں۔ جیسا

کہ قرآن مجید میں اس کی مثال واضح ہے:

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَأِئِكَةِ - اور (وہ وقت یاد کریں) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا۔ (البقرہ ۲: ۳۰)

یہاں قاعدہ نحو کے مطابق اذ سے پہلے اذْ كَرُفْعُ مَخْرُوفٌ ہے۔ جس کا معنی ہے ”یاد کرو“ جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا۔ اسی طرح حرف باء جس سے تسمیہ کا آغاز ہو رہا ہے سے بھی پہلے ایک فعل مخدوف ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس فعل کو مخدوف رکھنے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے۔

پہلی حکمت:

اگر ابداء یا اس جیسا کوئی لفظ بسم اللہ سے پہلے وارد ہوتا تو یہ امر واضح تھا کہ اس کا فاعل وہ شخص خود ہی ہوتا جو قرآن کی تلاوت یا کسی دوسرے کام کا آغاز کر رہا تھا۔ ابداء کا فاعل اللہ تعالیٰ کسی لحاظ سے بھی نہ ہو سکتا تھا۔ باری تعالیٰ چونکہ تعلیم یہ دینا چاہتے تھے کہ قرآن کی تلاوت ہو یا کوئی اور جائز کام اس کا آغاز اللہ کے نام سے ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس مخصوص ادب معاشرت کی تعلیم کلمات تسمیہ کے ذریعے دی جا رہی تھی۔ اس لیے یہ ہرگز مناسب نہ تھا کہ خود ان ہی کلمات کا آغاز اللہ کے نام کے علاوہ کسی دوسرے کے ذکر سے ہوتا۔ چنانچہ اس مخصوص ادب اور ضابطہ عمل کی تعلیم بھی اسی انداز سے دی گئی کہ اظہار مدعا کا آغاز بھی براہ راست اللہ ہی کے ذکر سے ہو۔ کسی اور کے ذکر سے نہیں۔ کیونکہ اسی طرح کمال برکت کا حصول ممکن ہے۔

دوسری حکمت:

صیغہ متکلم واحد کا استعمال ہوتا یا جمع کا، دونوں صورتوں میں قائل اپنا اور اپنے فعل کا ذکر اسم باری تعالیٰ پر مقدم کرتا۔ یہ امر ادب و احترام کی اعلیٰ منزلوں کے منافی تھا۔ یہ لحاظ عام گفتگو میں بھی رکھا جاتا ہے کہ اگر قائل کسی کام کے ضمن میں اپنے علاوہ دوسرے افراد کا ذکر بھی مشترکہ طور پر کرنا چاہتا ہو تو پہلے دوسروں کا نام لیا جاتا ہے اور آخر میں متکلم اپنا نام لیتا ہے کیونکہ یہ آداب تہذیب کلام کا حصہ ہیں۔ اپنا نام لینا معیار لطافت کے خلاف ہے۔ اسی طرح کسی کام میں افضل پر مفضول کی سہقت بھی خلاف ادب تصور کی جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال قرآن حکیم سے بیان کی جاتی ہے کہ بعض لوگوں نے عہد رسالت میں عید الاضحیٰ کے دن آنحضرت ﷺ سے پہلے قربانی کر دی اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول سے (کسی معاملہ میں) سبقت نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ سننے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْدُمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

والا اور خوب جاننے والا ہے O

(الحجرات: ۱:۴۹)

اللہ تعالیٰ نے باوجود اس کے کہ ان کا عمل حکم الہی کی اطاعت پر مشتمل تھا اور وہ خون بھی محض رضائے الہی کی خاطر بہایا گیا تھا جو کہ خالصتاً عبادت تھا۔ لیکن ان سے خطا صرف یہ سرزد ہوئی کہ وہ عمل میں وقتی طور پر نبی اکرم ﷺ پر تقدم کر بیٹھے تھے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ کو رسالت مآب ﷺ کی تعظیم و ادب کے منافی معلوم ہوئی۔ انہیں قربانیاں پھر سے کرنے کا حکم صادر کیا گیا اور آئندہ کے لیے حکماً اس اقدام کے امکان کو بھی ختم کر دیا گیا۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ بعض لوگ رمضان المبارک سے ایک دن قبل روزہ رکھنا شروع کر دیتے تھے اور اس طرح وہ آنحضرت ﷺ پر تقدم کر بیٹھتے تھے۔ چنانچہ اس آیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان کو حکماً منع فرما دیا۔ اس مثال کے ذریعے درحقیقت یہ بات واضح کرنا مقصود تھی کہ بعض اوقات تقدم خلاف ادب تصور کیا جاتا ہے چنانچہ بسم اللہ میں جو کہ خود ہی سراسر ادب کی تعظیم ہے، اسی اصول کو لفظاً بھی ملحوظ رکھا گیا ہے تا کہ کلام میں بھی ادب الوہیت نظر انداز نہ ہو کیونکہ یہی کمال ایمان کی علامت ہے۔ ادب سے محروم شخص علم و عمل کی بے پناہ دولتوں کے باوجود لذت ایمان سے محروم رہتا ہے۔ اسی لیے ہر سطح پر جس قدر بھی ملحوظ رہے بہتر ہے۔ کلام میں اس قدر لفظی احتیاط اور حکمت و مصلحت انسانی کوشش کے باوجود پیش نظر نہیں رہ سکتی۔ یہ صرف کلام الہی کا اعجاز ہے جو بغیر تصنع کے ان حکمتوں پر دلالت کر رہا ہے۔

تیسری حکمت:

یہ حکمتیں تو اُبداء وغیرہ کے الفاظ بسم اللہ پر مقدم نہ کرنے میں مضمر تھیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے نام سے پہلے کسی اور کا ذکر تو خلاف ادب تھا۔ اس لیے اسے مخدوف رکھا گیا۔ مگر بعد میں بیان نہ کرنے میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے۔ یہ امر ذہن نشین رہے کہ صاحب حکمت کا کوئی فعل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ جب اُبداء یا اشراع کی صورت میں کسی کام کے شروع کرنے کا ذکر آئے گا تو اس میں فاعل خود متکلم کی ذات ہوگی۔ گویا متکلم تسمیہ کے ذریعے کسی نہ کسی فعل میں اپنے فاعل ہونے کا ذکر بھی ساتھ ہی کر رہا ہوگا کہ ”اللہ کے نام سے میں (فلاں کام) شروع کرتا ہوں“۔ اس طرح فعل کی نسبت متکلم کی طرف ہو جاتی ہے اور اسی کا فاعل ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ یہاں مصلحت یہ تھی کہ انسان خود کو باری تعالیٰ کے لطف و کرم کا اس

حد تک محتاج سمجھے کہ تمام امور کی نسبت اسی ذات کاملہ کی طرف کر دے۔ ہر چند کہ افعال کا صدور انسان ہی سے ہوتا ہے۔ لیکن ہر فعل کے صادر کرنے کی قوت و ہمت اور طاقت و صلاحیت انسان کو بارگہ رب ذوالجلال سے نصیب ہوتی ہے کیونکہ تمام تو توں اور طاقتوں کا مبداء و سرچشمہ وہی ذات ہے۔ چونکہ تسمیہ میں بسم اللہ کے ذریعے خدا کی مدد اور اس کے فعل عنایت کا ذکر آ گیا تھا۔ اس کے بعد متکلم کا اپنا فاعل ہونا بیان کرنا اللہ تعالیٰ کی شان الوہیت کے منافی تھا۔ گویا یہ تعلیم دی گئی کہ اے انسان تو ہر کام شروع کرتے ہوئے خدا کا نام لے اور اس کام کی توفیق بھی اسی ذات کی طرف منسوب کر۔ کبھی بھی اس فعل کو اپنا کمال نہ سمجھ، کیونکہ فاعل حقیقی تو نہیں اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہاں انسانی فکر کو کبر و نخوت کی تباہ کاریوں سے بچنے کی صورت بتائی گئی ہے کہ اگر انسان زبان سے ذات حق کا نام لے کر دل میں یقین بھی اسی کی طاقت کی کار فرمائی پر رکھے گا تو سوچ کا یہ انداز سے کبھی بھٹکنے نہ دے گا۔ یہ فکر ایمانی آداب کا لازمہ ہے سورۃ نساء میں اسی کی تلقین کی گئی ہے۔

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ فَمَالِ هَؤُلَاءِ
الْقَوْمِ لَيَاكَاذِبُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثَنَا۔
(النساء: ۴۸)

فرما دیجئے سب کچھ اللہ کی طرف سے
ہی ہے تو ان لوگوں کو کیا ہوا۔ کوئی بات
سمجھتے معلوم نہیں ہوتے۔

یہاں ہر کام کی توفیق کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہونا مذکور ہے۔ اسی انداز سخن اور طرز فکر کی تلقین تسمیہ کے ذریعے کی جا رہی ہے۔ یہاں ایک اور لطیف نکتہ قابل غور ہے کہ بسم اللہ میں چونکہ ذکر صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور ابتداء فعل یا ارتکاب فعل کی نسبت انسان کی طرف مذکور نہیں ہے۔ اس لیے حکم ہے کہ بسم اللہ محض جائز کاموں کے آغاز میں پڑھی جائے۔ ناجائز اور خلاف شرع امور نہیں۔ کیونکہ غلط کاموں میں توفیق فعل کے حوالے سے ان کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف کرنا خلاف تقاضائے بندگی ہے۔ بندے کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو اپنے آقا کی طرف منسوب کرتا پھرے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ
وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ
نَفْسِكَ۔
(النساء: ۷۹)

(اے انسان اپنی تربیت یوں کر کہ)
جب تجھے کوئی بھلائی پہنچے تو (سمجھو کہ)
وہ اللہ کی طرف سے ہے (اسے اپنے
حسن تدبیر کی طرف منسوب نہ کر) اور
جب تجھے کوئی برائی پہنچے تو (سمجھ کہ) وہ
تیری اپنی طرف سے ہے (یعنی اسے
اپنی خرابی نفس کی طرف منسوب کر)۔

مذکورہ بالا دو آیات میں حقیقت حال بھی واضح کر دی گئی ہے اور آداب فکر و قول بھی کہ توفیق اور طاقت ہر کام کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے منسوب ہوتی ہے۔ لیکن نیکی صادر ہو تو بندگی یہ

ہے کہ انسان اسے اپنے آقا کی رحمت سمجھ کر اسی کی طرف منسوب کر دے اور بدی صادر ہو تو اسے اپنی سوچ اور کاوش کا نتیجہ سمجھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی انداز فکر سے انسان کی اپنے عیبوں اور کوتاہیوں پر نظر رہتی ہے اور وہ خود تنقیدی کے ذریعے اپنی اصلاح کا طالب و خوگر ہو سکتا ہے اور دوسری طرف وہ بعض اچھائیوں کو محض اپنی صلاحیت کا ثمرہ سمجھ کر پیکرِ رعونت بھی نہیں بننے پاتا۔ چونکہ ہر کام کی توفیق اور ہمت و قدرت کا مبداء منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس لیے تسمیہ میں اسی کے مجرذ ذکر پر اکتفا کیا گیا اور انسان کے فعل یا اس کے فاعل ہونے کا ذکر محذوف کر دیا گیا۔ گویا حقیقت کو عیاں رکھا اور جو کچھ محض ظاہر تھا اسے پوشیدہ کر دیا۔

آیت الحمد سے استدلال:

سورۃ الفاتحہ کا آغاز بھی اسی فلسفے کی نشاندہی کرتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○ سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام

جہانوں کی پرورش فرمانے والا ہے ○ (الفاتحہ: ۱)

یہ بات بڑی واضح ہے کہ جب کسی کی خوبی یا تعریف ہوگی تو یقیناً کوئی نہ کوئی تعریف کرنے والا بھی ہوگا۔ کیونکہ زبانِ حمد کھولے بغیر بیانِ حمد نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہاں حمد کا ذکر ہے حامد یا فعلِ حمد کا بیان نہیں ہے۔ محض اس لیے کہ اگر حمد کرنے والے کا ذکر کر دیا جاتا تو ممکن ہے وہ یہ سمجھتا کہ محمود میری حمد کا محتاج ہے یا میری تمجید نے اسے عظمت دی ہے۔ حالانکہ حمد کسی کا کارنامہ نہیں۔ یہ حسن الوہیت کا اپنا استحقاق ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے اپنا محمود ہونا بیان کر دیا۔ مگر کسی کا حامد ہونا صراحت سے بیان نہیں کیا۔

اسی طرح تسمیہ میں فعل اور فاعل کو مضمحل اور محذوف رکھنے میں حکمت یہ تھی کہ یقیناً وہ کام جس کے آغاز میں بسم اللہ پڑھی جا رہی ہے تو کوئی نہ کوئی شخص ہی کرے گا۔ لیکن کہیں وہ اپنی فاعلیت پر ایسا گمان نہ کرنے لگے کہ یہ کام میں اپنی ہمت و توفیق سے کر رہا ہوں۔ چنانچہ خدا کا نام محض برکت کی غرض سے نہیں بلکہ اس یقین و اعتماد سے لیا جائے کہ اس کام کی توفیق بھی محض اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے۔

چوٹھی حکمت:

اولاً یا آخراً کسی صورت میں بھی خدا کے ماسوا کے ذکر کا تسمیہ میں نہ ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ واجب الوجود صرف اسی کی ذات ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ممکن ہے اور اس وجہ سے ہا لک و معدوم۔ تسمیہ چونکہ تمام معارف قرآنی کا خلاصہ ہے اس لیے اس کا انداز بیان بھی دین حق کے جملہ مقاصد و مطالب کا خلاصہ ہوگا۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کا آغاز و انجام صرف خدا ہی کی ذات و صفات کے ذکر پر مبنی ہے اس کے علاوہ اس میں نہ کسی فعل کا بیان ہے نہ کسی فاعل کا۔

گویا یہ الفاظ خدا کی وحدانیت کو اسی طرح اجاگر کر رہے ہیں کہ اس کائنات میں اس کے بغیر نہ تو کسی فعل کا صدور ممکن ہے اور نہ کسی فاعل کا وجود۔ بلکہ دوام حقیقی اور ثبات ابدی اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ صرف خلاق عالم ہی کی ذات و صفات ہے۔ وہی اول تھا اور وہی آخر بھی ہوگا۔ اس لیے نہ اس سے پہلے کسی فعل کا ذکر ممکن ہے اور نہ اس کے بعد ارشاد بانی ہے۔

۱- هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ
وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝
(الحمدیہ: ۵۷: ۳)

وہ (سب سے) پہلا تھا اور (سب سے) آخر اور (اپنی قدرت کے اعتبار سے) ظاہر اور (اپنی ذات کے اعتبار سے) پوشیدہ ہے وہ سب کچھ خوب جانتا

۲- لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ۔
ہے ۝
حکم اللہ ہی کا ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔
(الروم: ۳۰: ۴)

اسی امر کا بیان ایک اور مقام پر اس طرح ہے۔
۳- لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كَلُّ شَيْءٍ
هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ۔
(القصص: ۲۸: ۸۸)

چنانچہ تسمیہ کے کلمات میں خدا کے سوا ہر قسم کے فعل اور فاعل کے ذکر کا محذوف و معدوم ہونا انسان کو پوری کائنات اور اسکے نظام کی بے ثباتی کی یاد دلاتا ہے۔ یہ کلام پکار پکار کر دنیا کی بے حقیقت رنگینیوں میں محو و مستغرق انسانوں کو حقیقت ابدی کی طرف متوجہ کر رہا ہے تاکہ لوگ خواب غفلت سے بیدار ہو کر بے کم و کاست اسی حکم الحاکمین کی قدرتوں اور قوتوں پر کامل ایمان لے آئیں اور اس سراب حیات کو ہی آخری منزل نہ سمجھ لیں۔

تسمیہ سے چونکہ قرآن کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس موقع پر جامع و مانع انداز سے خدا کی ہستی اور اس کی صفات کا ذکر اور اس کے ماسوا کا حذف و اضمحلال انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ دل و دماغ سے غیر کا خیال نکال دے اور ہر لمحہ ذات حق پر نظر رکھے۔ یہ معراج عبدیت ہے اور قرآن کا پہلا سبق بھی یہی ہے جیسا کہ ارشاد ایزدی ہے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَ مَا
تُوَلُّوا فَسَمَّ وَجْهَ اللّٰهِ۔
اور مشرق و مغرب (سب) اللہ ہی کا
ہے پس تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ
کی توجہ ہے۔
(البقرہ: ۲: ۱۱۵)

مزید برآں وہ ایسا موجود حقیقی ہے کہ ہر وجود کا مبداء بھی وہی ہے اور مرجع بھی۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں ہر وجود کائنات کا جواز بھی اسی کے وجود سے ہے۔ وہ حقیقت ہے اور اس کے

ماسوا جو کچھ ہے مجاز ہے۔ اس لیے تسمیہ میں حقیقت کا ذکر کیا گیا اور مجاز کو ترک کر دیا۔

حرفِ باء کی افادیت:

کلماتِ تسمیہ کا پہلا حرف ”با“ ہے۔ جس کا معنی ”سے“ کیا گیا ہے یہ فعلِ مخدوف سے متعلق ہے۔ مخدوف سے مراد وہ فعل اور فاعل ہے۔ جس کا ذکر یہاں لفظاً نہیں بلکہ معنماً موجود ہے۔ یعنی میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے گویا حرفِ باء فعلِ مخدوف کو اللہ کے نام سے ملانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ حرفِ باء کی اپنے استعمال و افادیت کے لحاظ سے متعدد اقسام ہیں۔ جنہیں علماء نحو نے شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن یہاں یہ حرف ان میں سے تین اقسام پر مشتمل ہو سکتا ہے۔

۱۔ باء الصاق و مصاحبت

۲۔ باء استعانت

۳۔ باء تین و تبرک

بائے مصاحبت:

الصاق و مصاحبت کا معنی اکٹھا ہونا اور رفاقت و معیت اختیار کرنا ہے۔

اس صورت میں جب کہ با مصاحبت کے لیے تصور کی جائے تو تسمیہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ میں اللہ کے نام کو اپنا سا بھی بناتے ہوئے اس کے دامنِ رحمت سے وابستہ اور منسلک ہوتے ہوئے اور محض اسی کی رفاقت و معیت پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے کام کا آغاز کرتا ہوں۔ امام فخر الدین رازیؒ اس مقام پر فرماتے ہیں۔

یہ ”با“ باء الصاق ہے چنانچہ یہ

بندے کو رب سے ملاتی ہے اور یہی
انسانی مقصود کا کمال ہے۔

هذا الباء باء الصاق فهو يلقى

العبد بالرب فهو كمال

المقصود۔

(تفسیر کبیر: ۹۹)

حرفِ باء کے اس مفہوم کی افادیت یہ ہے کہ تسمیہ کے ذریعے انسان کو اپنے ہر کام کے آغاز سے انجام تک خدا کی رفاقت و معیت کا احساس رہے۔ یہ امر واقع ہے کہ اگر انسان کو کسی نہایت قوی، مضبوط اور ہمدرد بھی خواہ سا بھی کی رفاقت کا احساس اور یقین ہو تو اسے کسی سطح پر بھی خوف و خطر دامنگیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انسان کو کارگہ زیست میں ہر خوف و غم سے بے نیاز کرنے کے لیے بسم اللہ کے ذریعے دل و دماغ میں یہ احساس جاگزیں کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو گے تو اس کی معیت بھی تمہیں حاصل ہوگی۔ جس کی حفاظت کے باعث تمہیں نہ کوئی نقصان پہنچ سکے گا اور نہ تمہاری کاوشیں بے نتیجہ حاصل ہوں گی۔ اسی تصور کو قرآن یوں بیان کرتا ہے۔

وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو اور
جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا
ہے

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللَّهُ بِمَا
تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝
(الحديد: ۵۷: ۴)

اسی شب ہجرت حضرت صدیق اکبرؓ کو غارتور میں تنہائی کے احساس سے کچھ خدشہ
محسوس ہوا کہ شاید کفار مکہ جو آنحضرت ﷺ کے تعاقب میں تھے۔ انہیں نقصان پہنچادیں۔ اس پر
حضور نبی اکرم ﷺ نے ان سے بزبان وحی ان سے ارشاد فرمایا:
لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنْزَلَ اللَّهُ
عِزَّهُ نَزْلًا سَكِينَةً عَلَيْهِ۔
غمزدہ نہ ہو بے شک اللہ ہمارے ساتھ
ہے پس اللہ نے ان پر اپنی تسکین نازل
فرمادی۔
(التوبة: ۹: ۴۰)

اس ارشاد پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ خدا کی معیت پر ایمان تو حضرت صدیق اکبرؓ کا
پہلے سے ہی تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس قدر عداوت و مخالفت کے ماحول میں اپنے گھر والوں
کو اکیلا چھوڑ کر حضور ﷺ کے شریک سفر نہ ہوتے۔ لیکن ظاہر اے سر و سامانی کا عالم تنہائی کا
ماحول اور کفار و مشرکین کے مخاصمانہ تعاقب کا خیال وقتی طور پر حزن و ملال کا باعث بن گیا اور یہ
انسانی طبیعت کا لازمی تقاضا بھی تھا۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے صرف انہیں معیت خداوندی کی
طرف متوجہ کر دیا۔ یہ احساس بحال ہونا تھا کہ دل کو سکون و اطمینان کی دولت نصیب ہوگی۔ گویا
معیّت خداوندی قلبی تسکین کا لازمی سبب ہے۔ یہی فلسفہ تسمیہ ہے کہ انسان خدا کی معیت کو
رفاقت کا احساس اجاگر کر کے جہد حیات کا آغاز کرے تو کوئی خوف و حزن سے اسے پریشان نہیں
کر سکتا۔ خوف و حزن سے نجات پا کر انسانی جدوجہد کو وہ تازگی اور قوت میسر آتی ہے۔ جس سے
کامیابی و کامرانی کی منزل بھی آسان ہو جاتی ہے۔ ورنہ بے یقینی اور مایوسی کی کیفیت تنگ و دو کو
مطلوبہ منزل تک نہیں پہنچنے دیتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

پس تم سستی نہ کرو اور خود صلح کی طرف نہ
بلاؤ اور تم ہی غالب آؤ گے اور اللہ
تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تمہاری
کوششیں بے نتیجہ نہیں
جانے دے گا۔

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلَامِ
وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ
يُتْرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ ۝
(محمد: ۳۷: ۳۵)

یہاں یہ امر ذہن نشین رہے کہ خدا کی معیت تو درحقیقت ہمہ وقت انسان کو حاصل
ہوتی ہے۔ لیکن اسے اس معیت کا احساس اور شعور نہیں ہوتا۔ شعور معیت الہی متحقق نہ ہونے کی
بناء پر وہ اس کے جملہ ثمرات و لطائف سے بہرور نہیں ہو سکتا۔ تسمیہ معیت الہی مہیا کرنے کے لیے
نہیں بلکہ اس کا شعور بیدار کرنے کے لیے ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اور بے شک ہم نے آدمی کو پیدا کیا
اور ہم جانتے ہیں جو وسوسہ اس کا نفس
ڈالتا ہے اور ہم اس سے اس کے دل کی

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا
تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ
إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۝

رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیں ۝ (ق، ۵۰:۱۶)

اس آیت سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ معیت الہی تو انسان کو پہلے سے ہی
میسر ہوتی ہے۔ لیکن اس کا شعور پیدا نہیں ہوتا۔ جب اس معیت و رفاقتِ خداوندی کا شعور انسان
کے اندر ایک زندہ قوت بن جاتا ہے تو تمام وساوسِ نفسانی اور دنیوی خطرات و خدشات نیست
و نابود ہو جاتے ہیں اور قلب و باطن پر اس احساس کے محیط ہو جانے سے ایک عجیب لطف و سکون
اور لذت و طمانیت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ انسان کو پھر نہ تو کسی اور کی رفاقت کی طلب رہتی
ہے اور نہ کسی کے قرب کی۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

لیکن اس لطف کا اندازہ بیان سے نہیں خود دھیان سے ہی ہو سکتا ہے کیونکہ لذت
بتانے کی نہیں حاصل کرنے کی چیز ہے۔

بائے استعانت:

استعانت سے مراد مدد طلب کرنا ہے اس کے معنی کے لحاظ سے مفہوم تسمیہ یہ ہوگا کہ
اللہ کے نام سے مدد طلب کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے قیامت
خیز طوفان سے اپنے پیروکاروں کو بچانے کے لیے حکم الہی سے ایک کشتی بنائی اور انہیں اس میں
سوار ہو جانے کو کہا۔ قرآن حکیم اس کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے۔

اور نوح نے کہا تم لوگ اس میں سوار ہو
جاؤ اللہ ہی کے نام سے چلنا اور اس کا
ٹھہرنا ہے بے شک میرا رب بڑا ہی

وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ
مَجْرَهَا وَمُرْسُهَا اِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ
رَّحِيمٌ ۝

بخشنے والا نہایت مہربان ہے ۝ (ہود، ۱۱:۴۱)

گویا اس آیت کے ذریعے جملہ مہمات میں خدائے رحمان و رحیم کے نام سے
استعانت کی تعلیم دی جا رہی ہے تاکہ انسان پر یہ حقیقت آشکار ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مدد و اعانت کے
بغیر نہ تو کسی خیر کو حاصل کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی شر سے محفوظ ہوا جاسکتا ہے۔ چونکہ فعلِ مخدوف کے
اعتبار سے یہاں کام کے شروع کرنے کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس لیے بائے استعانت کا معنوی
اطلاق یوں ہوگا کہ ”اے اللہ میں ہر کام کے شروع کرنے میں بھی تیری مدد کا محتاج ہوں۔“ جب

کوئی کام خدا کی مدد اور توفیق کے بغیر آغاز پذیر ہی نہیں ہو سکتا تو اس کا انجام پذیر ہونا کیونکر ممکن ہوگا۔ دراصل یہاں انسان کو اپنی حاجتمندی کا احساس دلایا جا رہا ہے تاکہ وہ دینیو متاع کو کثرت کے ساتھ حاصل کر کے خدائے لم یزل کے حضور سرینیا زخم کرنے سے باغی نہ ہو جائے۔ انسان کے ذہن میں یہ حقیقت ہر وقت موجود رہے کہ میں رب ذوالجلال کی عنایت کے بغیر اپنی جہد حیات میں پہلا قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ کس قدر ظالم اور احسان فراموش ہے وہ شخص جس کا قدم بھی خدا کے لطف و انعام سے اٹھے۔ لیکن وہ بجائے اس کی اطاعت کے اسی کے احکام کی خلاف ورزی کے لیے بڑھ رہا ہو۔ اگر انسان کا یہ شعور بیدار ہو کہ اس کی زبان کو قوت گویائی اس کے کانوں کو قوت سماعت اس کی آنکھوں کو قوت دید اس کے دست و بازو کو قوت عمل اس کے قدموں کو قوت نقل و حرکت اور اس کے دماغ کو قوت فکر الغرض سب کچھ خدا کی مدد و اعانت کے سبب میسر آیا ہے تو اس ظاہری اور باطنی اعضاء و جوارح میں سے کوئی عضو بھی رضائے الہی کے خلاف حرکت میں نہ آئے۔ ہم سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں اور ہمارے فکر میں جو تہم و انحراف جنم لیتا ہے یہ دراصل اسی شعور و ادراک کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ تسمیہ فی الحقیقت انسان کی فکری و عملی اصلاح کا شاندار ذریعہ ہے۔ اگر ہر کام شروع کرنے سے پہلے زبان اور دل خدا کا نام لینے اور اس سے مدد طلب کرنے کی طرف راغب ہوں اور یہ انکی عادی خصوصیت بن جائے تو انہی و محرمات سے از خود پرہیز ہونے لگے گا۔ کیونکہ خدا کی یاد کے ہوتے ہوئے حکم خدا کی خلاف ورزی ممکن نہیں رہتی۔

مزید برآں استعانت دعا ہے اور دعا خود مغز عبادت۔ اس لحاظ سے تسمیہ فی نفسہ عبادت کی روح قرار پاتا ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان خود کسی کام کے کر سکنے میں اپنے ذرائع اور اسباب و وسائل کے باوجود نا کافی و عاجز تصور کرتا ہے اور پھر اپنی بے بسی و بے کسی کے اعتراف کے ساتھ خدا بزرگ و برتر کی مناجات کرتے ہوئے اس سے مدد طلب کرتا ہے۔ گویا انسان بارگاہ ایزدی میں سراپا سوال بن کر حاضر ہے وہ دنیا و مافیہا سے ناامید اور تمام اسباب سے مایوس ہو کر مسبب الاسباب کی بارگاہ میں نیاز مندی کے ساتھ آن کھڑا ہوا ہے۔ اس کی آرزو مندی دل کو درد و سوز کی لذت سے آشنا کر دیتی ہے اور یہی کیفیت انسان کو مقام بندگی سے ہمکنار کرتی ہے۔ بقول شخصے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا مجھ کو
وگر نہ میں خدا ہوتا جو دل بے مدعا ہوتا
اسی مقام کو علامہ اقبال یوں بیان کرتے ہیں۔

متاع بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

قرآن میں حرف باء کا استعمال کئی مقامات پر اسی مقصد کے لیے ہوا ہے۔
ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا
بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ
الصَّابِرِينَ ۝

اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے
(مجھ سے) مدد چاہا کرو یقیناً اللہ صبر
کرنے والوں کیساتھ ہوتا ہے ۝

(البقرہ ۴: ۱۵۳)

یہاں صبر اور نماز دونوں کو ذریعہ استعانت کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ استعانت
تو لامحالہ باری تعالیٰ سے ہوگی لیکن اس کے کامل استحقاق کے لیے صبر و نماز کو اپنا لوتا کہ ان کے
واسطے سے اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اور عنایت و اعانت زیادہ سے زیادہ نصیب ہو سکے۔ اسی تصور کو
ایک اور مقام پر یوں واضح کیا گیا ہے۔

قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ
وَاصْبِرُوا۔

موسیٰ عليه السلام نے اپنی قوم سے فرمایا! تم
اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔

(الاعراف ۷: ۱۲۸)

اسباب سے صرف نظر کر کے مسبب الاسباب پر نظر رکھنا ہی صبر کہلاتا ہے۔ اس لیے
قرآن استعانت کے ساتھ توحید مطلب کی بھی تعلیم دے رہا ہے۔ تسمیہ میں بائے استعانت سے
پہلے یا بعد میں کسی کا ذکر نہیں۔ صرف خدا ہی کے نام پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جس کا واضح مقصد یہی
ہے کہ انسان کی تمام ضروریات و مشکلات میں خدا ہی کی ذات کافی ہے۔ اسے کسی اور چیز پر توکل
یا انحصار کی ضرورت نہیں۔

بائے تبرک:

تبرک کا معنی حاصل کرنا ہے۔ لہذا بائے تبرک کے حوالے سے تسمیہ کا معنی یہ ہوگا کہ ”
اللہ کے نام سے برکت حاصل کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں“۔ خدا کے نام سے شروع کرنا اس
اعتبار سے باعث برکت ہے کہ اس کام کے پایہ تکمیل تک پہنچنے کے امکانات زیادہ روشن
ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اسباب و وسائل کا مہیا کرنا بھی تو اسی کا کام ہے۔ اس لیے جب اس
ذات کے مقدس نام سے برکت طلب کی جائے تو وہ ذات اس کام کا انجام تک پہنچانا آسان
کردیتی ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو کام بسم اللہ پڑھے بغیر شروع کیا جائے وہ دم بریدہ اور ناقص رہ جاتا ہے جو کام بسم اللہ کے شروع کے بغیر شروع کیا جائے ناقص رہ جاتا ہے جس امر کا افتتاح خدا کے ذکر کے بغیر ہوگا وہ انجام خیر تک نہیں پہنچے گا۔

کل امر ذی بال لا یبدا فیہ بسم اللہ فهو أجزء او أقطع اولم یبدا فیہ باسم اللہ فهو أبترا ولا یفتح بذکر اللہ فهو أبترا أو أقطعا۔
۱۔ سنن ابن ماجہ: ۶۱۰، رقم: ۱۸۹۳
۲۔ کنز العمال: ۵۵۵، رقم: ۲۳۹

اس وقت ہمارے پیش نظر لفظ اسم کی لغوی اور معنوی دلالت نہیں ہے۔ سردست ہم نحوی قاعدے کے مطابق اس کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ عربی زبان میں کلمہ تین قسم کا ہوتا ہے۔

حرف، فعل اور اسم

تمام ائمہ نحو و ادب اس امر پر متفق ہیں کہ:

الحرف ہی الکلمة لا یصح الاخبار عنها ولا بہا۔
حرف وہ کلمہ ہے جو نہ تو کسی اور کی خبر دیتا ہے اور نہ خود کسی پر دلالت کرتا ہے۔
حرف جب تک کسی اور سے منسلک نہ ہو اس میں کوئی معنویت پیدا نہیں ہوتی۔ یعنی یہ از خود کسی کامل مفہوم کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے نہ ”مسند“ ہے اور نہ ”مسند الیہ“۔
الفعل ہی الکلمة لا یصح الاخبار عنها لکن یصح الاخبار بہا۔
فعل وہ کلمہ ہے جو فی نفسہ کسی اور کی خبر تو نہیں دے سکتا لیکن خود کسی نہ کسی خبر پر دلالت کرتا ہے۔

اس لحاظ سے فعل ”مسند الیہ“ نہیں۔ یعنی اس کو خود تو کسی عمل یا خبر سے نسبت ہوتی ہے مگر کسی اور کو اس سے بالذات کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ جب تک کوئی اسم اس کا فاعل بن کر مذکور نہ ہو۔ اس کی معنویت بھی کامل نہیں ہو سکتی۔

الاسم ہی الکلمة یصح الاخبار عنها وبہا۔
اسم وہ کلمہ ہے جو خود بھی کسی اور کی خبر دیتا ہے اور کوئی بھی اس سے نسبت رکھتا ہے۔

اس لحاظ سے اسم کو ”مسند“ اور ”مسند الیہ“ دونوں حیثیتیں حاصل ہوتی ہیں۔ یعنی یہ خود بھی اپنی ذات میں کسی نہ کسی کی خبر دیتا ہے اور کوئی دوسرا اس سے منسلک ہو جائے یا اس سے نسبت پیدا کر لے تو وہ بھی بامعنی یعنی کامل بن جاتا ہے۔ بد الفاظ و دیگر اسم خود ”کامل گر“ بھی ہے۔ مذکورہ بالا تینوں کلمات کا باہمی تعلق یہ ہے کہ حرف بھی اس سے نسبت پیدا کر کے خود کو بامعنی بناتا ہے

فعل بھی اسم سے نسبت پیدا کر کے اپنی معنویت اور دلالت کو کامل بناتا ہے۔ لیکن اسم ایک ایسا کلمہ ہے جو خود ہی اپنے مقصد اور ذات معینہ پر دلالت کرتا ہے یا اس کی خبر دیتا ہے۔ اس کو اپنی اس حیثیت کی تشکیل کے لیے نہ کسی اور حرف کی حاجت ہے نہ کسی فعل کی۔ گویا اسم میں دلالت کاملہ اور دلالت مطلقہ ہوتی ہے۔ فعل میں ناقصہ اور حرف میں سرے سے ہوتی ہی نہیں۔

تسمیہ میں فعل، حرف اور اسم کے باہمی تعلق پر اشارہ لطیف:

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں ”تسمیہ“ کے الفاظ پر غور فرمائیں تو ”فعل“ جس کا تعلق کسی غیر سے ہو سکتا تھا، مخدوف کر دیا گیا۔ کلمات تسمیہ کا آغاز ”حرف باء“ سے کیا گیا۔ جو اپنی ذات میں کوئی معنی و مفہوم نہیں رکھتا۔ اس میں جو بھی معنویت اور افادیت پیدا ہوئی ہے۔ صرف اسم کے ساتھ نسبت پیدا کرنے کے باعث ہوئی ہے۔ ”حرف باء“ کا مقصد محض اپنے ما قبل مخدوف کو یعنی کسی غیر کو جو متکلم یا فعل ہوگا، اسم کے ساتھ ملانا ہے۔ پھر لفظ ”اسم“ وارد کیا گیا اور اس کے بعد ”اللہ الرحمن الرحیم“ کے الفاظ بیان ہوئے۔ اسم کا معنی ”علامت“ ہے۔ ذات و صفات باری تعالیٰ کے ذکر سے پہلے ”اسم“ کا لایا جانا اس بات کو واضح کرنا تھا کہ اللہ اپنی واحدانیت، الوہیت اور ہویت میں اس طرح غیر محسوس و غیر مبصر، ہم وادراک سے بالا اور عقل و خرد سے بلند ہے کہ اس تک کسی کا وہم و گمان نہیں پہنچ سکتا، بندوں کا اس تک وصول محال ہے۔ لہذا اس مخفی و باطن اور پاک و منزہ ہستی تک وصول کے لیے ایسی علامت درکار ہے جو خود ظاہر ہو اس ہستی کی خبر دینے والی ہو، اپنی ذات کے ظہور میں بھی کامل ہو اور اس ذات مطلق کے اظہار کے لیے بھی کامل ہو، جو خود اس کی خبر بھی رکھتی ہو اور دوسروں کو اس سے باخبر بھی کر سکتی ہو یعنی وہ علامت ذات حق کے ظہور کی ایسی دلیل بن جائے کہ خود بھی اس سے ملی ہوئی ہو اور دوسروں کو بھی اس سے ملا سکے اور اس غرض سے دوسرے اس علامت سے نسبت و تعلق قائم کرنے کے لیے مجبور و مامور ہوں۔ ایسی علامت کاملہ جس کی شان یہ ہو کہ۔

أدھر سے اللہ سے واصل، ادھر مخلوق میں شامل

خواص اس برزخ کبریٰ کو ہے حرف مشدد کا

وہ علامت صرف ذات محمدی ﷺ کی ہی تھی جسے ”کلمہ اسم“ کے عنوان سے بطور ذریعہ

بیان کر دیا گیا۔

تصورِ دلالت اور کلمہ اسم کی وساطت:

یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ لفظ ”اللہ“ کی دلالت کے لیے کلمہ اسم بطور ذریعہ وارد ہوا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ”کیا ذات حق اپنی دلالت کے لیے کسی ذریعے کی محتاج ہے؟“ اس کا جواب صاف نفی میں ہے۔ بذات خود باری تعالیٰ اپنی دلالت کے لیے کسی ذریعے واسطے اور

علامت کی محتاج نہیں ہے لیکن اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کلمہ اسم اللہ ذات باری تعالیٰ ہی کی دلالت کے لیے بطور ذریعہ و علامت وارد ہوا ہے تو پھر اس ذریعے اور علامت کی احتیاج کس کو ہے۔

اس کا جواب خود عمارت تسمیہ میں ہے جو حرف باء سے شروع ہوتی ہے۔ ”حرف باء“ اپنے سے پہلے بہر صورت کسی فعل و فاعل کو مخدوف کے طور پر طلب کرتا ہے۔ یہ مخدوف وہ شخص ہے جو بارگہ الوہیت تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے جو ”ابداء اشرف“ اقرء وغیرہ“ کا فاعل ہے اور اس شخص کو ”اسم“ یعنی علامت ذات حق سے ملانے کے لیے حرف باء درمیان میں لگایا گیا ہے۔ گویا مخلوق خدا حرف باء کے توسط سے اسم کے ساتھ اپنی نسبت پیدا کر رہی ہے تاکہ اسم کے ساتھ نسبت اور تعلق پیدا کر کے طالبان حق کو ذات حق تک رسائی نصیب ہو سکے۔

یہ اسم علامت کے طور پر اس ہستی مبارکہ کو بیان کر رہا ہے جو ذات حق سے واصل اور اس کی عارف بھی ہے اور دیگر مخلوقات کو ذات حق کا وصال اور معرفت عطا کرنے والی بھی۔

ذات محمدی ﷺ کلمہ اسم کا مدلول کامل ہے:

پورا قرآن شروع سے آخر تک اس امر کی تائید کرتا ہے کہ اسی مقصد کے لیے دنیا میں انبیاء و رسل تشریف لاتے رہے۔ وہ ذات حق کی معرفت اور اس تک رسائی کا بہترین ذریعہ و واسطہ بھی تھے اور علامت و دلالت بھی۔ پھر یہ انبیاء و رسل ایک دوسرے پر فضیلت بھی رکھتے تھے۔ ارشاد فرماتا ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ -

یہ سب رسول (جو ہم نے مبعوث فرمائے) ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

(البقرہ ۲: ۳۵۳)

انبیاء و رسل کی تمام فضیلتیں جس نقطے پر جا کر اپنے منہائے کمال کو پہنچ گئیں۔ وہ نقطہ نبوت محمدی ﷺ کا تھا۔ اس لیے ذات حق پر آپ کی دلالت بھی سب سے زیادہ کامل و افضل تھی اور آپ کی شان علامت بھی سب سے ارفع و اعلیٰ تھی۔ اس لیے نبوت و رسالت جہاں مقام و مرتبہ کے اعتبار سے آپ کی ذات ستودہ صفات پر ختم ہوگئی۔ وہاں ادوار زمانی کے اعتبار سے بھی آپ ہی پر اختتام پذیر ہوگئی۔ چنانچہ ذات حق کی علامت نامہ اور دلالت مطلقہ ذات مصطفوی ﷺ قرار پاگئی۔ قرآن مجید نے کئی مقامات پر اس حقیقت کی واضح نشاندہی بھی کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ (قرآن) کی طرف اور رسول کی طرف آ جاؤ تو آپ منافقوں کو دیکھیں گے کہ وہ آپ کی

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَالْيَا رَسُولَ الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا

(النساء: ۴۱)

طرف رجوع کرنے) سے گریزاں رہتے ہیں ○

اس آیت نے صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ منافقت یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے واسطے کے بغیر ہی ذات حق کی بارگاہ میں بازیابی کے حصول کی کوشش کی جائے۔ یعنی منافقت کی پہچان یہ ہے کہ ”رسول کو وصال حق کا ذریعہ نہ مانا جائے۔ اس کو معرفت حق کی علامت اور ذات حق کی دلالت تسلیم نہ کیا جائے۔“ یعنی منافق یہ سمجھتا ہے کہ نسبت رسول ﷺ کے بغیر ہی احکام خداوندی پر عمل باعث ایمان ثابت ہو جائے گا۔ حالانکہ قرآن اسے ”منافقت“ کہہ کر رد کر چکا ہے۔ اسی تصور کو ایک اور مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے۔

اور (ان کی حالت تو یہ ہے کہ) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ رسول اللہ تمہارے لئے (اللہ سے) بخشش طلب فرمائیں تو (یہ گستاخی سے) سر ہلاتے ہیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ وہ بے رخی کرتے ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں ○

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوُوا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ○
(المنافقون، ۶۳: ۵)

ان گستاخان رسالت اور بے نیازان در نبوت کے بارے میں مزید حکم صادر کیا گیا۔ ”اے رسول اللہ ﷺ میری غیرت اور شان مجیت کا تقاضا یہی ہے کہ اگر یہ تیرے ذریعہ و واسطے کو اپنا کر میری ذات تک پہنچیں گے تو انہیں بخش دوں گا۔ لیکن اس طرح تجھ سے منہ موڑ کر تجھ سے تکبر کرتے ہوئے تجھے میری ذات تک رسائی کا واحد ذریعہ و واسطے اور علامت نہ سمجھتے ہوئے براہ راست مجھ سے معافی مانگنا چاہیں یا تو سراپا رحمت و رافت ہونے کی بناء پر انکے غرور و تکبر کے باوجود اپنے طور پر ان کیلئے مغفرت مانگے تو میں ان بد بختوں کو پھر معاف نہیں کروں گا۔ ان کو تجھ سے منہ موڑنے کا مزہ چکھا کر ہی رہوں گا۔“

آپ ان کے لئے بخشش مانگیں یا ان کے لئے بخشش نہ مانگیں ان کے حق میں برابر ہے اللہ ان کو ہرگز نہ بخشے گا۔

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ -
(المنافقون، ۶۳: ۶)

اگر یہ آپ کی سفارش، شفاعت اور غلامی کے ذریعہ کوٹھکرا کر بھی بخشے جائیں تو پھر ان غلامان رسالت کا کیا حال ہوگا جو قدم قدم پر تیری بارگاہ میں نیاز مندیاں کرتے ہیں اور تجھے میری ذات کی علامت سمجھ کر تیرے واسطے سے مجھ تک پہنچتے ہیں۔ میں ان بد نصیبوں کو ان خوش نصیبوں کے برابر نہیں ٹھہرا سکتا اور پھر میرا دستور مغفرت ہی یہی ہے کہ لوگ بارگاہ رسالت کی وساطت سے مجھ تک پہنچیں۔

باری تعالیٰ خود اعلان فرماتے ہیں۔

اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور (اے حبیب) اگر وہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول ﷺ بھی ان کے لئے مغفرت طلب کرتے تو وہ (اس وسیلہ اور شفاعت کی بنا پر) ضرور اللہ کو توبہ قبول فرمانے والا نہایت مہربان

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ
بِإِذْنِ اللَّهِ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا
أَنْفُسَهُمْ جَاءُوا فَاسْتُغْفِرُوا
اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ
لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا ۝

(النساء: ۴: ۶۴)

پاتے ۝

اس آیت کا مفہوم و مدعا سابقہ آیت کی روشنی میں سمجھا جائے تو حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ لوگ ظلم و معصیت کے بعد اگر ذات محمدی ﷺ کو واسطہ وصال الہی اور ذریعہ مغفرت حق مان کر در رسول ﷺ پر سر نیاز خم کر دیں، حضور اکرم ﷺ کی وساطت سے بارگاہ الوہیت تک رسائی کی آرزو کریں اور حضور ﷺ کو ذریعہ و واسطہ سمجھنے سے انکاری ہوں بلکہ آپ کی سفارش سے ہی منہ پھیر لیں تو پھر کوئی صورت نہیں کہ وہ بخشے جائیں۔ اس لیے کہ اندریں صورت میں ان کی بخشش سنت الہی کے خلاف ہے اور ارشاد ایزدی ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝
اور آپ اللہ کی سنت میں کبھی فرق نہ
پائیں گے ۝

(فتح، ۲۸: ۲۳)

متذکرہ بالا آیات نے اس حقیقت کو اظہر من الشمس کر دیا کہ ذات حق تک رسائی کے لیے صرف اور صرف ذات محمدی ﷺ ہی واسطہ و ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو تسمیہ میں ”کلمہ اسم“ سے تعبیر کر دیا گیا اور آپ کو علی الاطلاق برہان من ربکم (تمہارے رب کی طرف سے حتمی و قطعی دلالت) کے لقب سے سرفراز کیا گیا ہے۔ چنانچہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی اولین تعلیم ہی یہی تھی کہ ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفات کاملہ تک رسائی واسطہ و علامت کے بغیر ممکن نہیں اور وہ

واسطہ جلیل ذات محمد مصطفیٰ ﷺ ہے جسے اس ذات نے محمد، احمد، حامد اور محمود کے اسماء مبارکہ کے ذریعے اپنی شان اسمیت سے نواز رکھا ہے۔

ذات محمدی ﷺ اور شان اسمیت:

مذکورہ بالا تحقیق کا خلاصہ یہ ہوا کہ جناب مصطفیٰ ﷺ ”اسم“ ہیں کیونکہ ان کو اللہ سے نسبت ہے اور ساری مخلوق خدا کو ان سے نسبت ہے یہی اسم کی شان اور تعریف پہلے بیان ہو چکی ہے کہ وہ مسند بھی ہوتا ہے اور مسند الیہ بھی۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی اسی حیثیت کو اس طرح واضح فرمایا:

إنما أنا قاسم واللہ يعطي۔
(صحیح مسلم، ۲: ۳۳۳، ۱۲۔ کتاب الزکوٰۃ؛
۳۳۔ باب انہی عن المسألة؛ رقم
حدیث: ۱۰۰)

بے شک نعمتوں کو مخلوق خدا میں تقسیم میں
ہی کرنے والا ہوں اور مجھے عطا اللہ تعالیٰ
کرتا ہے۔

اس حدیث صحیح کے ذریعے ذات محمدی ﷺ کی دو نسبتیں واضح ہو گئیں۔

۱۔ نسبت الی الخالق۔ ۲۔ نسبت الی المخلوق

”نسبت الی الخالق“ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ خالق سے حاصل کرتے ہیں اور ”نسبت الی المخلوق“ یہ ہے کہ مخلوق میں تقسیم فرماتے ہیں۔

سورہ الاحقاف میں یہی دو نسبتیں خاص انداز سے بیان کی گئی ہیں۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ
فَتَرْضَىٰ ○ أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا
فَأَوَّىٰ ○ وَوَجَدَكَ ضَالًّا
فَهَدَىٰ ○ وَوَجَدَكَ عَائِلًا
فَأَغْنَىٰ ○

(الضحیٰ، ۹۳: ۵-۴)

اور بے شک قریب ہے کہ آپ کا رب
آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی
ہو جائیں گے کیا اللہ نے آپ کو حالت
یتیمی میں نہ پایا۔ پس اس نے آپ کو
بلند مقام سے سرفراز کر دیا اور اس نے
آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ پایا۔ پس
اپنا قرب و وصال عطا کر دیا اور اس نے
آپ کو اپنی نعمتوں کا ضرورت مند
اور طلبگار پایا تو اتنا عطا کیا کہ غنی اور
مالدار کر دیا۔

ان آیات میں پہلی نسبت کا بیان تھا کہ جس چیز کی ضرورت ذات مصطفویٰ ﷺ کو محسوس ہوئی رب ذوالجلال نے حضور اکرم ﷺ کو عطا کر دی۔ اپنی نعمتوں اور عطاؤں کے خزانے نے ذات نبوی پر اس طرح کھول دیئے کہ انہیں ”غنی“ یعنی بے نیاز کر دیا۔ اب مخلوق خدا کو

حکم دیا کہ میری نعمتوں اور عطاؤں کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہارے لیے واسطہ اتم مقرر فرما دیا ہے۔ جاؤ در رسول اللہ ﷺ پر حاضری دو وہاں دامن سوال دراز کرو جو کچھ مانگو وہی کچھ ملے گا۔ کیونکہ ہم نے عطا میں کوئی کمی نہیں کی، وہ تقسیم میں بھی کچھ نہیں کریں گے۔ ساتھ ہی ”نسبت الی الخلق“ کے حوالے سے اپنے اسم مقدس کو حکم صادر فرمایا:

فَمَا الَّتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا
السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ
رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝
(الضحیٰ، ۹۳: ۱۱)

پس اے محبوب! اے تقسیم کرنے والے!
اب اگر آپ کے پاس کوئی یتیم آئے تو
اس (کے مانگنے) پر ناراض نہ ہوں اور
جو کوئی سائل آپ کے در پر آئے۔ پس
اسے خالی نہ موڑیے اور اپنے رب کی
عطاؤں اور نعمتوں کو ہر ایک میں تقسیم
کر کے خوب چرچا کرو۔

لہذا ذات محمدی ﷺ کی شان اسمیت یہ قرار پائی کہ ”نسبت الی الخلق“ کے نتیجے میں ساری کائنات میں انعامات الہیہ کی تقسیم کے فیضانِ رحمت کے مظہر اتم بن گئے اور ”نسبت الی الخلق“ کے نتیجے میں ساری کائنات میں انعامات الہیہ کی تقسیم کے ضامن بن گئے بقول مولانا احمد رضا خان:

بخدا خدا کا یہی ہے در نہیں اور کوئی مفر مفر

جو وہاں سے ہو یہاں آ کے ہو جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

سورۃ الضحیٰ کی آیت متذکرہ ۸ اور ۱۰ اور حدیث مذکورہ بالا دونوں مقامات میں نہ ”عطا“ میں تخصیص فرمائی گئی ہے اور نہ تقسیم میں۔ عطا بھی مطلق اور بلا قید ہے۔ تقسیم بھی مطلق اور بلا قید ہے۔ اسی طرح سائلان و وابستگان پر بھی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی کہ تم کیا مانگو اور کیا نہ مانگو۔ جو کچھ بھی مانگو گے، دنیا مانگو یا آخرت، سب کچھ ملے گا کیونکہ ہم نے اپنے محبوب کو بلا اسستی تمہاری ضرورتوں سے بھی زیادہ عطا کر دیا ہے۔ پھر اس سے قبل یہ بھی اعلان فرما دیا گیا۔

وَلَا خَيْرَ لَكَ مِنَ الْاُولٰٓئِ ۝
اے محبوب! تمہاری ہر آنے والی گھڑی
گزری ہوئی گھڑی سے بہتر ہوگی۔
(الضحیٰ، ۹۳: ۴)

یعنی آپ پر ہر آن ہماری عطاؤں کا سلسلہ بڑھتا رہے گا۔ جب عطاؤں میں کمی نہیں آسکتی اسی طرح تقسیم میں بھی کمی یا رکاوٹ نہیں آنی چاہیے۔ چنانچہ ابدالآباد تک ذات محمدی ﷺ کی یہ دونوں نسبتیں (نسبت الی الخلق)۔۔۔ جو حصولِ فیضان سے عبارت ہے اور نسبت الی الخلق۔۔۔ جو تقسیمِ فیضان سے عبارت ہے) قائم و دائم رہیں گی۔ اس لیے قرآن کے پیغامِ ابدی کے ساتھ ساتھ مخلوقِ خدا کے لیے اسم مقدس ﷺ کا فیضانِ وساطت و رسالت بھی جاری و ساری

رہے گا۔

حرفِ جار کی نسبت ایک لطیف نکتہ:

یہاں یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ تسمیہ میں کلمہ اسم کو حرفِ جار (باء) سے منسلک کیا گیا ہے ”جر“ کے معنی کشش اور جذب کرنے کے ہوتے ہیں۔ حرفِ جار کشش کے لیے مقرر ہے چونکہ حرفِ جار فعلِ مخدوف کو اسم سے ملانے کے لیے واقع ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو بھی ذاتِ حق کا ماسوی ہے اور اسے ذاتِ باری تعالیٰ کا قرب و وصال اور معرفت و اعانت مطلوب ہے۔ وہ ذاتِ محمدی ﷺ سے جسے بطور علامت عنوان ”اسم“ کے تحت بیان کیا گیا ہے جذب و کشش پیدا کر لے۔ اسے جس قدر ذاتِ محمدی ﷺ کا قرب اور جذب و کشش نصیب ہوگی اسی قدر ذاتِ حق کی محبوبیت کا سزاوار ہوتا چلا جائے گا۔

جیسے کہ ارشادِ خداوندی ہے۔

(اے حبیب!) آپ فرمادیں اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو تب اللہ تمہیں (اپنا) محبوب بنا لے گا۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ - (آل عمران، ۳: ۳۱)

نبی اکرم ﷺ نے اپنی اسی شانِ کریبی کا ذکر کرتے ہوئے یوں فرمایا:

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میری مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی اور جب اس آگ نے ماحول کو روشن کر دیا تو اس میں پروانے اور حشرات الارض گرنے لگے وہ شخص ان کو آگ میں گرنے سے روکتا ہے اور وہ اس غالب آگ میں دھڑا دھڑا کر رہے ہیں پس یہ میری مثال اور تمہاری مثال ہے میں تمہاری کمر پکڑ کر تم کو جہنم میں جانے سے روک رہا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ جہنم کے پاس سے چلے آؤ اور تم لوگ میری بات نہ مان کر جہنم میں گرے جا رہے ہو۔

مثلی کمثل رجل استوقد ناراً فلما أضاءت ماحولها جعل الفراش و هذه الدواب التي في النار يقعن فيها و جعل يحجزهن و يغلبهن فيتنحمن فيها قال فذلکم مثلی و مثلکم أنا أخذ بحجرکم عن النار هل من النار هل من النار فتغلبونی و تقحمون فیها -

(صحیح مسلم، ۲: ۲۴۸، ۲۴۳ - کتاب الصغائر، ۶ - باب شفقتہ علی امتہ رقم: ۱۸)

اس حدیث کے ذریعے اس جذب و کشش کی ماہیت بھی واضح ہوگئی جو کلمہ کے باعث

اسم مقدس میں پیدا ہو گئی تھی۔ اسم نحوی کا خاصہ جر من حیث الوقع ہے اور اسم الہی کا خاصہ جر من حیث الصدور ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ذریعے باری تعالیٰ نے ”توحیدِ خالص“ کی تعلیم دی لیکن اس کی صحت و قبولیت کی شرط بھی متعین فرمادی اور وہ شرط واسطہ رسالت محمدی ﷺ ہے۔ اسی لیے اسم ذات ”اللہ“ کو علی التخصیص الرحمن الرحیم کے ذریعے صفتِ رحمت سے اجاگر کیا تاکہ ”شان اسمیت“ کے معنی و مفہوم پر بھی دلالت ہو جائے کہ اسم مقدس کا کامل ترین مدلول ذات محمدی ﷺ ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	اطراف الآيات	حواله	صفحه
۱	الحمد لله رب العالمين O	الفاخر: ۱	۲۱
۲	ولله المشرق والمغرب فاينما تولوا ...	البقرة: ۱۱۰: ۲	۲۳
۳	يا ايها الذين آمنوا استعينوا بالصبر والصلوة...	البقرة: ۱۵۳: ۲	۲۹
۴	تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض ...	البقرة: ۲۵۳: ۲	۳۴
۵	قل ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحبكم الله...	آل عمران: ۳۱: ۳	۴۱
۶	واذا قيل لهم تعالوا الي ما انزل الله...	النساء: ۶۱: ۳	۳۴
۷	وما ارسلنا من رسول الا ليطاع باذن الله...	النساء: ۶۴: ۳	۳۶
۸	قل كل من عند الله فمال هولاء القوم...	النساء: ۷۸: ۳	۲۰
۹	ما أصابك من حسنة فمن الله وما أصابك...	النساء: ۷۹: ۳	۲۰
۱۰	فكلوا مما ذكر اسم الله عليه...	الانعام: ۱۱۸: ۶	۱۳
۱۱	ومالكم ان لاتاكلوا مما ذكر اسم الله عليه...	الانعام: ۱۱۹: ۶	۱۴
۱۲	قال موسى لقومه استعينوا بالله واصبروا...	الاعراف: ۷: ۱۲۸	۲۹
۱۳	لاتحزن ان الله معنا فانزل الله سكينه عليه...	التوبة: ۲۰: ۹	۲۵
۱۴	قال اركبوا فيها باسم الله مجرها ومرساها...	هود: ۱۱: ۴۱	۲۷
۱۵	انه من سليمان وانه بسم الله الرحمن الرحيم O	الملك: ۲۷: ۳۰	۱۲۸
۱۶	لا اله الا هو كل شى هالك الا وجهه...	القصص: ۲۸: ۸۸	۲۳
۱۷	الله الامر من قبل ومن بعد...	الروم: ۳۰: ۴	۲۲
۱۸	فلا تهنوا وتدعوا الى السلم وأنتم الاعلون...	محمد: ۴۷: ۳۵	۲۶
۱۹	لن تجد لسنة الله تبديلاً O	الفتح: ۲۳: ۲۸	۳۷
۲۰	يا ايها الذين آمنوا لا تقدموا بين يدي الله...	الحجرات: ۴۹: ۱	۱۸
۲۱	ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس...	ق: ۵۰: ۱۶	۲۶
۲۲	وهو الاول والاخر والظاهر والباطن...	الحديد: ۵۷: ۳	۲۲

صفحہ	حوالہ	اطراف الآيات	نمبر شمار
۲۵	الجرید ۴:۵۷	وهومعکم این ماکنتم واللہ بما تعملون بصیر ○	۲۳
۳۵	المنافقون ۵:۲۳	وإذا قيل لهم تعالوا يستغفر لكم...	۲۴
۳۶	المنافقون ۶:۲۳	سواء علیہم استغفرت لهم أم لم تستغفر لهم..	۲۵
۴۰	النحیٰ ۴:۹۳	وللآخرة خیر لک من الاولیٰ ○	۲۶
۳۸	النحیٰ ۱۱:۹۳ تا ۹	ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ ○	۲۷
۳۹	النحیٰ ۱۱:۹۳ تا ۹	فاما الیتیم فلا تقهر واما السائل...	۲۸
۱۵	العلق ۱:۹۶	اقراء باسم ربک الذی خلق ○	۲۹

نمبر شمار	اطراف الاحاديث و الآثار	صفحه
۱	ان النبي ﷺ و ابا بكر و عمر كانوا يفتتحون الصلوة... ...	۱۰
۲	أنتم تتفحمون في النار كالقراش و انا اخذ... ...	۴۱
۳	إنما انا قاسم و الله يعطى... ...	۳۸
۴	صليت خلف رسول الله ﷺ و ابي بكر و عمر.. ...	۱۱۰
۵	فامر رسول الله ﷺ با خفائها... ...	۱۱
۶	فلما نزلت هذه الآية امر رسول الله ﷺ... ...	۱۱
۷	فاوحى الله تعالى يا عيسى هذا العبد مذمات... ...	۱۳
۸	كان المسلمون لا يعرفون انقضاء السورة... ...	۹
۹	كل أمر ذي بال لم يبداء فيه بسم الله فهو أجزم... ...	۳۰
۱۰	كل أمر ذي بال لا يبداء فيه بسم الله الرحمن الرحيم فهو أجزم... ...	۱۴
۱۱	لا وضوء لمن لم يذكر اسم الله عليه... ...	۱۴
۱۲	مثلي كمثل رجل استوقد ناراً... ...	۴۱

نمبر شمار	أعلام	صفحه
۱	ابوحنیفہؒ	۹
۲	ابووائلؒ	۱۰
۳	ابوہریرہؓ	۸
۴	احمدؒ	۳۷
۵	احمد بن حنبلؒ امام	۸
۶	احمد رضاؒ امام	۳۹
۷	اقبالؒ علامہ	۳۹
۸	الس بن مالکؒ	۱۰
۹	اوزاعیؒ امام	۹
۱۰	حامدؒ	۳۷
۱۱	رازیؒ امام فخر الدین	۲۴۱۵
۱۲	زہریؒ	۸
۱۳	سعید بن جبیرؒ	۸
۱۴	سعید بن منصورؒ	۱۰
۱۵	سفیان ثوریؒ	۹
۱۶	سلیمان علیہ السلام	۱۲
۱۷	شافعیؒ امام	۸
۱۸	صبا	۱۲
۱۹	صدیق اکبرؒ	۲۵۱۰
۲۰	طاؤسؒ	۸
۲۱	عائشہ صدیقہؓ	۱۸
نمبر شمار	أعلام	صفحه
۲۲	عبداللہ بن زبیرؒ	۸
۲۳	عبداللہ بن عباسؒ	۸
۲۴	عبداللہ بن عمرؒ	۸

۸	عبداللہ ابن مبارکؓ	۲۵
۱۰	عثمانؓ	۲۶
۸	عطاءؓ	۲۷
۸	علی مرتضیٰؓ	۲۸
۱۰	عمر فاروقؓ	۲۹
۱۳	عیسیٰ علیہ السلام	۳۰
۹	مالکؓ، امام	۳۱
کثیر الاستعمال	محمد	۳۲
۳۷	محمود	۳۳
۸	مکحولؓ	۳۴
۱۱	مسئلہ کذاب	۳۵
۲۹	موسیٰ علیہ السلام	۳۶
۲۷	نوح علیہ السلام	۳۷